© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

شیخ غلام علی علوی دہلوی

برصغیر کے تیرھویں صدی کے ان علما و فقہا میں جنھوں نے زمرۂ صوفیا میں شہرت پائی، مولانا شاہ غلام علی دہلوی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ وہ بجا طور پر شیخ الشیوخ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کا اصل وطن بٹالہ تھا جو مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کا مشہور شہر ہے۔ مختلف اوقات میں یہ شہر اصحاب علم اور ارباب فضیلت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایک خاندان علوی سادات کا تھا، اس خاندان کے بزرگوں میں شاہ غلام علی کے والد ماجد شاہ عبداللطیف بٹالوی بہت مشہور بزرگ تھے۔ زہد و عبادت اور تقویٰ و قناعت میں عالی مرتبے پر فائز تھے۔ دنیا اور امور دنیا سے منقطع ہو کر جنگلوں کی تنہائی میں جا کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور کئی کئی مہینے اسی عالم میں گزار دیتے۔ شاہ ناصر الدین قادری کے مرید تھے اور عوام و خواص میں بہت تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ غلام علی نے اس نیک باپ کے گھر ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۵ء) میں جنم لیا۔ شاہ غلام علی کے عم محترم بھی دین داری اور صالحیت کا پیکر تھے، جنھوں نے سرسید احمد خاں کے بقول "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا۔" لیکن "غلام علی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

شاہ غلام علی سترہ اٹھارہ برس کی عمر تک بٹالہ اور اس کے گرد و نواح میں رہے اور وہیں کے اساتذہ سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ اس زمانے میں ان کے والد شاہ عبداللطیف کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا اور وہ شاہ ناصر الدین قادری سے بیعت تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے فرزند دلبند کو بھی انھی کے حلقۂ بیعت میں شامل کر دیں۔ چنانچہ باپ کی خواہش کے مطابق ۱۱۷۴ھ میں انھوں نے دہلی کا قصد کیا۔ لیکن جس دن وہ دہلی پہنچے، اسی دن شاہ ناصر الدین قادری کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد والد بزرگ وار نے سعادت مند بیٹے سے کہا کہ اب جس کی چاہیں بیعت کر لیں۔ اس اثنا میں وہ پورے چار سال مختلف بزرگوں کے آستانوں پر حاضر ہوتے رہے۔ اس وقت دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، شاہ غلام علی ان کی خدمت میں گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں کا درس لیا اور سندِ فراغت سے بہرہ مند ہوئے۔ اس دوران میں شاہ رفیع الدین سے بھی استفادہ کیا۔ اب وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علومِ رسمیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے آستانۂ رشد و ہدایت پر پہنچے اور ان کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت عمر کی بائیس منزلیں طے کر چکے تھے اور بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ مرزا صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور یہ شعر پڑھا:

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم سرزمینے بود منظور آسمانے یافتم

(سجدۂ عشق کے لیے میں نے ایک آستاں پالیا۔ مجھے تو ایک سرزمین کی ضرورت تھی لیکن میں نے آسمان پالیا)۔

بیعت کے بعد پندرہ سال مرشد کی مجلسِ ذکر میں بسر کیے اور مجاہدہ و ریاضت کی مختلف منزلیں طے کیں۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحبِ ارشاد ہوئے۔ انھوں نے بیعت تو سلسلۂ قادریہ میں کی تھی لیکن ذکر و اذکار اور شغل و اشغال طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور تمام طرقِ تصوف کی اجازت حاصل کی۔ اپنے مرشد مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت (۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور تمام صوفیائے عصر پر فوقیت لے گئے۔ تا دمِ وفات پورے پینتالیس سال مسندِ ارشاد پر متمکن رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفیض فرمایا۔

شاہ غلام علی نہایت پابندِ سنت اور متوکل علی اللہ تھے۔ اس دور کے امرا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان کی خدمت کریں اور خانقاہ کو مالی امداد دیں لیکن شاہ صاحب نے ان کی یہ پیشکش کبھی قبول نہ فرمائی۔ ایک دفعہ والیِ ٹونک نواب امیر محمد خاں نے انتہائی التجا سے ان کے اور خانقاہ کے درویشوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ جواب میں ان کو یہ شعر لکھ بھیجا:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

(ہم فقر و قناعت کی آبرو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے، امیر خاں سے کہہ دو کہ روزی اللہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہاں سے مقرر ہے)۔

ان کی ذاتِ عالی قدر سے بے شمار لوگوں نے فیض پایا اور بہت سے ملکوں کے لاتعداد افراد نے حاضرِ خدمت ہو کر ان کی بیعت کی۔ ہندوستان کے علاوہ ترکی، شام، بغداد، مصر، چین، افغانستان، کردستان اور حبش کے لوگ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور شرفِ ارادت حاصل کیا۔ وہ عوام و خواص کا مرکزِ عقیدت اور مرجعِ خلائق تھے۔ کہنا چاہیے:

چو کعبہ قبلۂ حاجت شد، از دیارِ بعید روند خلق بدیدارش از بسی فرسنگ

(چونکہ کعبہ مرکزِ حاجات قرار پایا ہے، اس لیے لوگ دور دراز کا سفر کر کے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں)۔

ان کی خانقاہ میں ہر وقت کم و بیش پانچ سو فقیر اور درویش رہتے تھے، جو ان سے فیض حاصل کرتے تھے اور باوجودیکہ کہیں سے باقاعدہ ایک حبّہ بھی مقرر نہ تھا، لیکن سب کے کھانے پینے اور لباس کا وہ خود ہی انتظام کرتے تھے اور یہ تمام سلسلہ اللہ تعالیٰ کی غیبی امداد سے چلتا تھا۔ فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، جس نے جو مانگا دے دیا۔ جو اچھی اور عمدہ چیز بطور تحفہ کہیں سے آتی، اس کو بیچ کر فقرا پر خرچ کر دیتے۔ جو موٹا کھسوٹا خانقاہ کے درویشوں کو میسر ہوتا، وہی خود بھی پہنتے، جو کھانا عقیدت مند کھاتے، وہی آپ تناول فرماتے۔ اگر کوئی اچھا کپڑا پہننے اور اچھا کھانا کھانے کے لیے کہتا تو فرماتے:

خاک نشینی است سلیمانیم ننگ بود افسر سلطانیم

ہست بسے سال کہ می پوشمش کہنہ نہ شد جامۂ عریانیم

(میری سلیمانی خاک نشینی ہے۔ میرے لیے سلطانی کا تاج باعثِ ننگ ہے۔ بہت مدت سے میں لباسِ عریانی پہن رہا ہوں، لیکن ابھی تک وہ لباس پرانا نہیں ہوا ــــ یعنی حرص و طمع اور فخر و غرور سے میرا دل پاک ہو گیا ہے)۔

اگر کبھی اسبابِ مادی اور سامانِ دنیا کا ذکر آتا تو بیدل کا یہ شعر پڑھتے:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں ہرچہ ما داریم نذاں ہم اکثرے در کار نیست

(اے بیدل! حرص میں قناعت ہی نہیں ہے، ورنہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، اس کا بیشتر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصہ ایسا ہے، جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یعنی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہماری ضرورت سے زائد ہیں)۔

ان کے شب و روز کا زیادہ حصہ عالمِ بیداری میں گزرتا، بہت کم سوتے، زیادہ تر مصروفِ عبادت رہتے۔ نیند غالب آتی تو جائے نماز پر ہی سو جاتے۔ خانقاہ میں بوریا کا فرش اور بوریا ہی کا مصلّیٰ تھا۔ وہیں چمڑے کا ایک تکیہ تھا، دن رات اسی مصلّے پر نشست رہتی اور تمام وقت عبادت میں بسر ہوتا۔ طالبین ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی شخص فرش کے لیے کہتا تو جواب میں سکندر لودی کے معاصر جمالی کے یہ شعر پڑھتے:

لُنگکے زیر و لُنگکے بالا نے غم دزد و نے غمِ کالا
گزکے بوریا و پوستکے دلکے پُرزِ دردِ دوستکے
ایں قدر بس بود جمالی را عاشقِ رند لاابالی را

(ایک لنگی نیچے اور ایک لنگی اوپر یہی ہمارا لباس ہے، جس کے سبب نہ تو کسی چور کا ڈر ہے اور نہ کسی سامان کا غم۔

ایک گز بوریا اور پوستین اور ایسا دل جو درد اور دوست کی آرزو سے پُر ہے۔

جمالی کے لیے جو ایک عاشق اور رند لاابالی ہے، یہی بہت ہے)۔

انھوں نے احکام شریعت سے کبھی تجاوز نہ کیا، ہمیشہ امورِ سنت کو پیشِ نگاہ رکھا، مالِ مشتبہ ہرگز قبول نہ کرتے، جو شخص خلافِ شرع اور خلافِ سنت کوئی حرکت کرتا، اس سے نہایت خفا ہوتے اور اس کا اپنے قریب آنا گوارا نہ کرتے۔ اس سے مخاطب ہو کر فرماتے:

یا مرو با یارِ ازرق پیرہن یا بکش بر خانماں انگشت نیل
یا مکن با پیلباناں دوستی یا بنا کن خانہ در خورِ پیل

(یا تو نیلے لباس والے دوست کے پاس نہ جا، یا پھر خاندان پر نیل کی انگلی پھیر دے۔
یا تو مہاوتوں کے ساتھ دوستی نہ رکھ، یا پھر ہاتھی کے لائق اپنا گھر بنا)۔

مطلب یہ کہ ہمارے شریکِ مجلس ہونا چاہتے ہو یا ہماری صحبت و رفاقت میں آنے کا ارادہ ہے تو ہمارا رنگ اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ احکام شرع کی مخالفت بھی کرو اور ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حلقے میں بھی بیٹھو۔ یہ دو عملی یہاں نہیں چلے گی۔

شاہ غلام علی نے اپنے اوقاتِ شب و روز کا ایک نقشہ بنا رکھا تھا، جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے۔ نمازِ فجر اوّل وقت میں ادا کرتے، اس کے بعد تلاوتِ قرآنِ مجید ہوتی، وہ قرآن کے حافظ تھے اور قرأت میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اشراق تک حلقۂ مریدین میں بیٹھتے اور صوفیا کے طریقے کے مطابق توجہ اور استغراق کا سلسلہ جاری رہتا۔ نمازِ اشراق سے فارغ ہو کر تفسیر اور حدیث کا درس دیتے۔ پھر تھوڑا سا کھانا کھا کر سنتِ نبوی کے مطابق قیلولہ کرتے۔ بعد ازاں اوّل وقت نمازِ ظہر ادا کی جاتی۔ پھر طلبا و مریدین کو تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کی کتابیں پڑھاتے۔ فقہی مسائل کی بھی وضاحت فرماتے، نمازِ عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عصر کی نماز سے اوّل وقت میں فراغت کے بعد مریدین کا حلقہ قائم ہوتا۔ عشا کے بعد وظائف میں مشغول ہو جاتے اور اسی حالت میں نیند آجاتی۔ پھر تہجد کے لیے اُٹھ جاتے۔ عقیدت مندوں کو بھی نمازِ تہجد کی تاکید فرماتے۔

بلاشبہ شاہ صاحب ممدوح تیرھویں صدی ہجری کے جیّد عالم، نامور صوفی، عظیم المرتبت فقیہ، عابد و زاہد اور صاحبِ فضل و کمال بزرگ تھے۔ ان کی وجہ سے دیارِ ہند کی روحانی دنیا میں بہت بڑا انقلاب رونما ہوا، اور لوگوں کے قلب و ذہن کی دنیا متغیر ہوئی۔ اسی بنا پر ان کے عقیدت مند انھیں تیرھویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ تو بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے ہی، دیگر اسلامی ممالک کے بھی بے شمار حضرات ان سے مستفیض ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں اور ملکوں میں جا کر دینِ خالص کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔

شاہ غلام نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، لیکن دہلی میں ان کی خانقاہِ تصوف شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس کا مقابلہ کرتی تھی اور ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ انتہائی وسعت اختیار کر گیا تھا۔ ان میں بہ یک وقت دو متہم بالشان اوصاف پائے جاتے تھے۔ یعنی طریقِ ولی اللّٰہی کا اعتدال و توازن اور علم و عرفان بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا، اور مجدد الف ثانی کے جذبۂ احیائے دین، ذوقِ تصوف اور ولولۂ اتباعِ سنت سے بھی پوری طرح بہرہ مند تھے۔ علومِ عقلی و نقلی کے ماہر اور تبلیغ و اشاعتِ دین کے دلدادہ تھے۔

سرسید احمد خاں کے والد ماجد سید محمد تقی مرحوم کے شاہ صاحب بہت کرم فرما تھے۔ سید احمد خاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ولادت کے وقت ان کے والد نے شاہ صاحب کو گھر تشریف لانے کے لیے عرض کیا، وہ آئے اور نومولود کے کان میں اذان دی اور سلسلۂ مجددیہ کے امام حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نام پر بچے کا نام احمد رکھا۔ سید احمد سے شاہ صاحب پوتوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ سید احمد بھی ان کا انتہائی احترام کرتے اور انھیں "دادا حضرت" کہتے تھے۔ سرسید نے "آثار الصنادید" میں نہایت عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے اندازِ تبلیغ، اتباعِ سنت اور علوِ مرتبت کی عمدہ طریقے سے وضاحت کی ہے۔ ان کے والدِ ماجد، افرادِ خاندان اور خود سرسید سے ان کو جو محبت و مودت تھی، اور پھر سرسید کا خاندان ان سے جو عقیدت و احترام رکھتا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی، اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزادہ مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے:

کرم ہائے تو ما را کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں نے اپنے تئیں غمِ زن و فرزند سے دور رکھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت فرزندوں سے سوا دے دی۔ جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ ــــ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلّے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں خصوصاً صغرسنی میں جو چاہتا سو کہتا، جو چاہتا سو کرتا اور حرکاتِ بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا . . . سال ہا سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم منور رہا۔[1]

شاہ صاحب کے تلامذہ اور مسترشدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور اس میں ہندوستان کے ہر

---

[1] آثار الصنادید، ص ۲۱۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاقے اور اسلامی ملکوں کے متعدد اربابِ کمال شامل تھے۔ ان میں سے جن حضرات نے خاص طور سے شہرت پائی، ان میں سید اسماعیل مدنی، شیخ احمد کردی، شیخ خالد رومی، شیخ محمد جان باجوری، شیخ ابو سعید دہلوی، ان کے بیٹے مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا رؤف احمد رام پوری، مولانا بشارت اللہ بہرائچی اور سید ابوالقاسم حسینی واسطی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے بے پناہ دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ خالد رومی نے اپنے وطن ترکی واپس جاکر مرشد کے علم و تصوف کو خوب پھیلایا اور تمام دولتِ عثمانیہ میں اس کی تبلیغ و اشاعت کی۔ وہ ترکی کے بلند پایہ علما میں سے تھے، عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے، ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے:

خبر از من دہید آں شاہِ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شد بارِ دگر از ابرِ نیسانی

(حسینوں کے اس بادشاہ کو میری طرف سے یہ خبر پوشیدہ طور پر پہنچا دو کہ ابرِ نیسانی کی بدولت دنیا ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے)۔

اس سے آگے چل کر کہتے ہیں:

امامِ اولیا، سیاحِ پیدائے خدا بینی — ندیمِ کبریا، ملّاحِ دریائے خدادانی
مہینِ راہنمایاں، شمعِ اولیائے دین — دلیلِ پیشوایاں، قبلۂ اعیانِ روحانی
چراغِ آفرینش، مہرِ برجِ دانش و بینش — کلیدِ گنجِ حکمت، محرمِ اسرارِ سُبحانی
امینِ قدس عبداللہ شہے کز التفاتِ او — دہد سنگِ سیاہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

ان اشعار کا ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:

وہ اولیا کا امام اور خدا بینی کا ظاہر سیاح ہے۔ وہ کبریا کا ندیم اور پیشواؤں کے سمندر کا ملاح ہے۔

وہ راہنماؤں کا سردار اور تمام اولیائے دین کی شمع ہے۔ وہ حکمت کا رہبر اور روحانی بزرگوں کا قبلہ ہے۔

وہ خلقت کا چراغ اور دانش و بینش کے برج کا سورج ہے۔ وہ حکمت کے خزانے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چابی اور اسرارِ سبحانی کا محرم ہے۔

قدس کا امین یعنی عبد اللہ ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی عنایت و توجہ سے سنگِ سیاہ میں لعلِ بدخشانی کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاہ غلام کے زمانے کو سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دورِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن علمی اور روحانی لحاظ سے یہ نہایت عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں لاتعداد علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و سلوک کے حلقے قائم تھے، جن کے اثر و رسوخ اور شہرت و قبولیت کے دائرے برِ صغیر کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئے تھے اور بہت سے اسلامی ملکوں تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ دہلی کے افق پر اس وقت علم و معرفت کا جو شامیانہ تنا ہوا تھا، اس کے متعلق شیخ خالد رومی کہتے ہیں:

به دہلی ظلمتِ کفراست، گفتند و به دل گفتم به ظلمت رو اگر در جستجوئے آب حیوانی

یعنی مجھے بتایا گیا کہ دہلی میں کفر کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن میں نے اپنے دل سے کہا کہ اگر تجھے آبِ حیات کی ضرورت ہے تو پھر تاریکی ہی کی طرف چل۔

بہرحال شاہ غلام علی دہلوی دنیائے تصوف و طریقت کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ، علومِ عقلی و نقلی کے بھی ماہر تھے۔ ان کے ملفوظات ان کے ایک مرید مولانا رؤف احمد رام پوری نے مرتب کیے۔ ان کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروجہ کے ماہر تھے اور ان علوم کا باقاعدہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی، تجرد کی زندگی بسر کی، وظائف و اوراد، تعلیم و تدریس اور تلامذہ و مریدین کی ذہنی و روحانی اور علمی تربیت ہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔

اس عالمِ اجل اور ولیِ کامل نے ۱۲ صفر ۱۲۴۰ھ کو دہلی میں وفات پائی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے[۱۱] اللھم برد مضجعہ و وسع مدخلہ۔

---

[۱۱] آثار الصنادید، ص ۲۰۷ تا ۲۱۲ — واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲ ص ۱۵۳ تا ۱۵۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۵۶ تا ۳۵۸ — رودِ کوثر ص ۶۴۹ تا ۶۵۷ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵۵ — علم و عمل، ج ۱، ص ۲۶۰ — خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۹۳ تا ۶۹۸ — گلزارِ اولیا، ص ۴۷ تا ۵۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com